محمد یوسف

عبدالرحمٰن پشاوری

یہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے۔

ماہ مئی کے انہی دنوں میں صوبہ سرحد کے ایک مایہ ناز فرزند عبدالرحمٰن پشاوری نے استنبول میں موت و زیست کی کشمکش کے بعد اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

عبدالرحمٰن پشاوری ایک نامور خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد حاجی غلام صمدانی پشاور کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ انھوں نے نہ صرف کاروبار میں نام پیدا کیا اور بے شمار دولت پیدا کی۔ بلکہ انھوں نے اپنی دولت کا بہت بڑا حصہ فی سبیل اللہ خرچ کیا۔ چنانچہ انھوں نے پشاور میں دو مساجد کی تعمیر کے لیے رقم دی۔ دینی مدارس کی بھی مالی امداد کی۔ حاجی غلام صمدانی کوئی پڑھے لکھے بزرگ نہ تھے مگر انھوں نے اپنے بچوں کی مذہبی اور دنیاوی تعلیم کا معقول بندوبست کیا۔ ان کے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔

عبدالرحمٰن ۱۸۸۶ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ گھر پر مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ پشاور کے سکول میں داخل ہوگئے، جہاں سے وہ ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ چلے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں ان کو اپنے قریبی دوست فضل امین حیدرآبادی (دکن) کے کالج سے نکالے جانے کی وجہ سے علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔ فضل امین اس وقت کالج میں تھے اور بین الاقوامی سیاست کے

اچھے نبض شناس تھے۔ وہ اسلامی ممالک میں انگریزوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا حسرت موہانی کے پرچے "اُردوئے معلّیٰ" میں مصر میں انگریزی حکومت پر جو تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا اور جس پر مولانا حسرت موہانی کا چھاپہ خانہ ضبط ہوگیا تھا اور ان کی قیمتی کتابیں کوڑیوں کے مول نیلام ہوگئیں وہ انھیں بزرگ کا لکھا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن کو ان کی دوستی سے بہت فائدہ پہنچا۔ ایک۔ تو یہ کہ ان کا علمی ذوق بہت وسیع ہوگیا، دُوسرے وہ انگریزی سیاست کے پیچ وخم اور مُسلمان ملکوں سے انگریزوں کی صدیوں پُرانی دشمنی کو سمجھنے لگے تھے۔ عبدالرحمٰن علی گڑھ سے نکل کر کچھ دنوں شملہ میں رہے۔ پھر انھوں نے پشاور سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور پھر ۱۹۱۱ء میں جب ان کی علی گڑھ سے نکالے جانے کی میعاد ختم ہوگئی پھر علی گڑھ پہنچ گئے اور ایف اے میں داخلہ لے لیا۔

ابھی وہ طالب علم ہی تھے کہ برطانیہ اور روس کے اشارے پر بلقان کی عیسائی حکومتوں نے سلطنتِ عثمانیہ کو بلقان سے نکالنے کے لیے اس پر حملہ کردیا۔ کوئی سو برس سے روس اسی فکر میں تھا اور اسی مقصد کے لیے اس نے کئی مرتبہ ترکوں سے جنگ بھی کی کریمیا کی جنگ اسی مقصد کے لیے لڑی گئی۔ مگر اس کو بُری طرح ناکامی ہوئی۔ کیونکہ برطانیہ اور فرانس کسی طرح بحرِ متوسط میں روسی اثر کو دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں رُوس نے رومانیہ اور بلغاریہ کو اسی مقصد کے لیے پھر استعمال کیا۔ مگر معاہدۂ برلن کے بعد پھر اس کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انگلستان کا وزیرِاعظم گلیڈ اسٹون ترکوں کا سخت مخالف تھا اور اس نے اپنی ایک انتخابی مہم میں ۱۸۷۶ء میں بلقان کے مسئلہ کو ایک اہم مسئلہ بناکر پیش کیا تھا۔ اس مہم میں اس نے اس مشہور فقرے کا استعمال کیا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے بوریا بستر سمیت نکال دینا ہوگا۔

گلیڈ اسٹون کی لبرل پارٹی کے ایک مشہور ممبر سر ایڈورڈ گرے تھے جو ترک دشمنی میں مشہور تھے۔ اور یہ ۱۹۱۲ء میں مسٹر اسکوئتھ کی وزارت میں وزیرِ خارجہ تھے۔ اُنھوں نے روس کی بلقان میں پیش قدمی سے چشم پوشی کی۔ دُوسری طرف رُوس نے بلقان کی ریاستوں

کو ترکی پر حملہ کرنے کی شہ دی۔ اسوولسکی جو زارِ روس کا وزیر خارجہ رہ چکا تھا اور اس کو روسی سیاست کا ماہر کہا جاتا تھا۔ اس وقت وہ فرانس میں روسی سفیر تھا۔ اس کو برطانیہ سے جو اشارہ ملا اس کو اس نے غنیمت جانا اور بلغاریہ اور رومانیہ کو تیار کر دیا لیکن جب بلغاری فوجیں ادرنہ سے آگے بڑھنے لگیں تو انگریزوں کو اپنی پالیسی کی کمزوری کا احساس ہوا۔ اور انھوں نے بلقانی ریاستوں کے درمیان جو جھگڑا ترکی کے مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کے بارے میں شروع ہوگیا تھا، اس کو نمٹا کر ترکوں اور بلقانی ریاستوں کے درمیان صلح کرادی تاکہ رُوس کا اثر آگے نہ بڑھنے پائے۔

ہندی مسلمانوں کا طبی وفد

ابھی ترک طرابلس الغرب میں اٹلی کے حملوں سے اچھی طرح سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ بلقان میں معرکہ حرب و ضرب گرم ہوگیا۔ مصر اس وقت عملی طور پر انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ عراق، شام، اور عرب میں برطانیہ اور فرانس کی ریشہ دوانیاں ترکوں کے خلاف جاری تھیں۔ لیکن اس کے باوجود عربوں کا خاصا ترکی فوج میں شامل تھا۔ ترک اس وقت مجبوری کے عالم میں تھے۔ اب صرف ہندوستان کے مسلمانوں نے مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ترکوں کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ ہندوستانی مسلمان خود محکومی کی حالت میں تھے اس لیے کوئی فوجی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ایک طبی وفد بھیجنے کی تجویز ہوئی جو میدانِ جنگ میں ترک مجروحین کی مرہم پٹی اور ان کی باقاعدہ نگہداشت کرے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہندوستان کے مشہور سرجن تھے۔ ان کی سرکردگی میں مولانا محمد علی نے ایک طبی وفد کو ترتیب دیا۔ اس میں کوئی پچیس چھبیس افراد تھے جن میں پانچ ڈاکٹر تھے۔ اس میں تقریباً ہندوستان کے ہر حصہ کے لوگ تھے۔

عبدالرحمٰن اس وقت علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہ اپنی تعلیم چھوڑ کر طبی وفد میں شریک ہوگئے۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کے آخر میں یہ وفد ہندوستان پہنچا اور اس کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ پہلے اس وفد کے اراکین کی تعیناتی استنبول سے کوئی ساٹھ میل مغرب میں شتلجہ کے قریب ایک گاؤں عمرلی میں ہوئی۔ یہاں اس طبی وفد کی یادگار کے طور پر ایک پتھر

نصب ہے۔ اسی جگہ عبدالرحمٰن نے دُوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ترک مجروحین کی اس طرح دیکھ بھال کی کہ ترکوں پر ان کی محبت اور دلسوزی کا بڑا اثر ہُوا۔ دراصل یہ ایک اسلامی جذبہ تھا جس سے عبدالرحمٰن اپنے رفقاء کی طرح متاثر ہو کر بلقان گئے تھے۔ ان کا تبادلہ کئی مقام پر جہاں اسپتال تھے ہوا۔ ہندوستانی ہسپتال کی کارگردگی دوسرے ہسپتال کے مقابلہ میں اتنی اچھی تھی کہ ترک مجروحین ہندوستانی ہسپتال میں جاکر علاج کرانا پسند کرتے تھے۔

بلقان کی جنگ کے بعد عبدالرحمٰن کی ملاقات ترکی کے مشہور امیرالبحر رؤف بے سے ہوئی جو "حمیدیہ" جہاز کے بے مثال کارناموں سے تمام یورپ میں مشہور ہو چکے تھے۔ رؤف بے اور عبدالرحمٰن کے خیالات میں اتنی ہم آہنگی تھی کہ رؤف بے نے ان کو اپنا مُنہ بولا بھائی بنالیا اور پھر دونوں ساتھ رہے۔

جنگ بلقان کے بعد عبدالرحمٰن ہندوستان واپس نہیں آئے۔ بلکہ ترکی کے فوجی کالج میں تعلیم کے لیے داخل ہو گئے۔ ابھی فوجی کالج میں تھے کہ پہلی عالمگیر جنگ شروع ہو گئی جنگ کے زمانے میں یہ عراق میں انگریزوں کے خلاف ایک ترکی دستہ کی کمان کر رہے تھے کہ ایک جگہ ہندوستانی سپاہیوں میں گھر گئے۔ اپنی ترکی وردی پھینک کر اور پنجابی بول کر یہاں سے صاف بچ کر نکل گئے۔

جنگ میں ترکوں کی شکست اور تباہی کے بعد یہ استنبول میں رُوپوش ہو گئے۔ پھر جب مصطفیٰ کمال پاشا نے اناطولیہ میں ترکی کی آزادی کے لیے جنگ شروع کی تو وہ اناطولیہ چلے گئے۔ اور قابلِ قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں یہ ترکی کی طرف سے افغانستان میں سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں ترکی واپس گئے اور فوجی خدمات میں مشغول ہو گئے۔ مئی ۱۹۲۶ء کے ابتدائی دنوں میں رات کے وقت ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ کسی نے ان کو اندھیرے میں گولی کا نشانہ بنایا۔ دو ہفتے وہ ہسپتال میں رہے مگر زخم اتنا کاری تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن خُدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

آج ہم ان کو یاد کرتے ہیں اور ان کی رُوح پر فاتحہ پڑھتے ہیں کیونکہ انھوں نے اپنی شہادت سے پاکستان اور ترکی کے مسلمانوں کے درمیان اسلام کے ناقابلِ شکست رشتے کو اور مضبوط کر دیا۔